اِسلام میں عورت کی شہادت

محترمہ اُمِّ حسن صاحبہ - منصورہ - لاہور

(۳)

تنہا عورتوں کی شہادت رہے وہ معاملات جن میں عورت شب و روز لگی رہتی ہے اور جو اس کے ذوقِ مزاج اور رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں - ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی طرح مکمل اور پورا شمار کیا ہے۔ بلکہ امام شعبی نے تو یہاں تک کہا ہے:

"مِنَ الشَّهَادَاتِ مَا لَا يَجُوْزُ فِيْهِ إِلَّا شَهَادَةُ النِّسَاءِ"
یعنی شہادت کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن میں صرف عورتوں ہی کی شہادت جائز ہے۔"

اس مسئلہ میں امام زہریؒ کا بیان ہے کہ:

"سنت یہ رہی ہے کہ صرف عورتوں کی شہادت ان معاملات میں جائز ہے جن سے عورتوں کے علاوہ کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا یعنی بچے کی ولادت یا اُن کے عیوب وغیرہ"۔

دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں سے مخصوص معاملات میں صرف عورتوں ہی کی شہادت معتبر ہے۔ وہاں مرد کی گواہی کی ضرورت ہے نہ افادیت، انہی کی گواہی پر شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بچہ زندہ پیدا ہونے کی شہادت دی گئی، تو پھر اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی - اِس کے متعلق احکامِ وراثت پر بھی عمل ہوگا،

ورنہ نہیں، یا یہ مسئلہ کہ عورت باکرہ ہے یا نہیں، بالغ ہے یا نابالغ، ان کی امراض کی شہادت وغیرہ۔ حمل کی مدت کا تعین، گورنمنٹ یا پرائیویٹ ملازم عورتیں، عورتوں ہی کی شہادت (سرٹیفیکیٹ) کی بنا پر رخصت کا حق حاصل کرتی ہیں۔

البتہ اس بات میں فقہاء کا اختلاف موجود ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں بھی کتنی عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ امام مالکؒ دو عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں جبکہ بعض فقہاء چار عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں۔ امام ثوری اور احناف کے نزدیک ایک عورت ہی کی شہادت کافی ہے۔ احناف اس بات کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ عورتوں کے پوشیدہ مقامات کو دیکھنے میں جتنی قباحت مردوں کے لیے ہے اتنی ہی قباحت ایک عورت کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کے معائنہ کرنے میں بھی ہے لہٰذا ایک عورت کی گواہی کافی ہونا ہی مصلحت کا تقاضا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حالات تقاضا کرتے ہوں وہاں عام معاملات میں بھی ایک عورت کی شہادت قرائن کی موجودگی میں قبول کی جائے گی۔ مثلاً حضرت معاویہؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے صرف حضرت اُمِ سلمہؓ کی شہادت پر ایک مکان کے متعلق جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ ("عورت اسلامی معاشرہ میں" ص ۱۸۷ - از جلال الدین عمری)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کا فیصلہ صرف ایک یا دو آدمیوں کی زبانی شہادت ہی پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ بہت سے داخلی اور خارجی قرائن اور علامات ایسے ہوتے ہیں جو اصل حقیقت کی وضاحت کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ علامات بہرحال دوٹوک اور قطعی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ شریعت نے فیصلہ کی بنیاد انسانوں کی قطعی اور دوٹوک گواہی پر ہی رکھی ہے۔ البتہ بعض مخصوص معاملات کے سوا عام حالات میں ان علامات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر یہ علامات کہیں واضح شکل میں موجود ہوں یا احتیاط اور تقویٰ ایک خاص طرح کے فیصلہ کا تقاضا کر رہے ہوں تو شریعت نے صرف ایک گواہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔ چنانچہ امام زہری سے روایت ہے کہ تین مختلف گھرانوں میں شادی بیاہ کے ذریعے رشتہ قائم ہوا تو ایک عورت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور اس نے کہا یہ سب میری رضاعی اولاد

ہیں اور میں نے ان کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی شہادت کی بنا پر ان کے نکاح فسخ کرا دیئے۔

روایتِ حدیث کے سلسلہ میں عورت پر اعتماد عورتوں سے جو احادیث مروی ہیں خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہوں، تمام علماء و فقہاء امت نے ان پر کلی اعتماد کیا ہے۔ اور روایات کے سلسلے میں مردوں عورتوں کا فرق کئے بغیر ان کو یکساں اہمیت دی ہے۔ بعض بعض احادیث ہم تک ایسی سندوں سے پہنچی ہیں جن میں کئی کئی خواتین موجود ہیں۔ خود امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ نے ایسی بہت سی روایتیں قبول کی ہیں جن کی سندوں میں دو دو، تین تین خواتین کا ذکر ہے۔ کیا یہ عورتوں پر اعتماد کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح رواۃ حدیث کے متعلق عورتوں نے جو جرح و تعدیل کی ہے اس کو تسلیم کیا۔ اور ان کی رائے کے مطابق کسی راویٔ حدیث کی روایات کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شریعت کا عورت پر اعتماد ان امور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شریعت عورت پر کلی اعتماد کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک حدیث روایت کرتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عقیدت و احترام کا جذبہ ان میں غفلت یا بے توجہی کرنے سے انسان کو بچا لیتا ہے۔ اور آدمی پوری شعوری کوشش سے ان کو ضبط کرتا ہے۔ جب کہ یہ نفسیاتی کیفیت روایت کے سلسلہ میں تو موجود ہوتی ہے۔ مگر عام معاملات میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا شریعت نے روایت اور شہادت میں خود فرق قائم رکھا ہے۔ یعنی جن امور میں عورت براہ راست متعلق ہوتی ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کافی ہے۔ اور جو چیزیں اس کے دائرۂ کار سے باہر ہیں وہاں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ابن رشد اپنی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں لکھتے ہیں "آئمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے مطابق: بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۴۶۵۔

شہادت کے متعلق تفصیلات قرآن مجید نے عورت کی شہادت کے سلسلہ میں جو الفاظ

استعمال کئے ہیں "فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ" اور اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى
ان سے کئی ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ وہ فقہ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایک دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

۱۔ تنہا عورتوں کی گواہی: بعض فقہاء عورتوں کے مخصوص مسائل میں اور قرائن کے ساتھ عام مسائل میں بھی تنہا عورت کی گواہی کے قائل ہیں، جیسا کہ اوپر تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

۲۔ مشترکہ گواہی: بعض فقہاء وہ ہیں جو صرف مالی معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یعنی مشترکہ گواہی کے قائل ہیں۔ مثلاً امام مالکؒ اور امام شافعیؒ، جب کہ بعض فقہاء حدود و قصاص کے علاوہ ہر معاملہ میں مرد و عورت کی مشترکہ گواہی قبول کرتے ہیں۔

۳۔ شہادت کی ایک تیسری قسم وہ ہے جسے حدود و قصاص کہا جاتا ہے، جس میں کچھ فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی سرے سے تسلیم ہی نہیں ہے، جبکہ بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ جب عورت کے سہو و نسیان کی کمی دو عورتوں کی شہادت سے پوری کر دی گئی تو پھر ہر مسئلہ میں عورت کو گواہی کا حق ملنا چاہیے۔ علامہ ابن حزمؒ اور علامہ ابن قیمؒ جیسے بزرگوں کی رائے ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے۔ البتہ ان کی یہ رائے ضرور ہے کہ جن اُمور کا تعلق براہ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے دائرہ کار سے خارج ہیں تو اُن کے متعلق اس کی شہادت میں سہو و نسیان کا زیادہ امکان ہے۔ قتل، زنا، چوری، تہمت تراشی، ڈکیتی وغیرہ یہ سب جرائم بڑے سنگین اور بھیانک ہیں؛ ایک طرف شریعت نے ان کی معیّن سزائیں رکھی ہیں جن میں حاکمِ وقت اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ دوم یہ سزا پانے کے بعد آدمی اگر زندہ رہ بھی جائے تب بھی معاشرہ میں اس کا وقار بُری طرح مجروح ہوتا ہے۔ اور عزت و احترام جاتا رہتا ہے۔ اس لیے ان کا فیصلہ یقینِ کامل کی بنا پر ہونا چاہیے۔ دوسری طرف عورت کی پوزیشن یہی ہے کہ وہ گھر کی مالکہ ہے، ایک خاص ماحول میں اس کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ اُسے ان حالات اور اسباب سے کم ہی واسطہ پیش آتا ہے، جن میں یہ بھیانک جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے معاملہ میں

اس کا مشاہدہ اتنا مکمل اور درست نہیں ہوتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کی نرمی اور احساسِ شدت کی بنا پر قتل، چوری، ڈکیتی جیسے جرائم کا تمام جزئیات کے ساتھ مشاہدہ کرنا، پھر اس کو بلاکم و کاست یاد رکھنا اور من و عن عدالت میں بیان کرنا اس کے لیے آسان نہیں ہے، لہٰذا حدود و قصاص کے ضمن میں اُمت نے اس کی گواہی کی حوصلہ شکنی کی ہے، مگر جہاں صرف عورتیں ہی گواہ ہیں اور مقدمہ قتل یا چوری کا ہے، وہاں اُمت میں تنہا عورتوں ہی کی شہادت پر فیصلے کرنے کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ مگر یاد رہے کہ آیت شہادت میں قرآن کے الفاظ میں اِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کہ جہاں دو مرد نہ ہوں وہاں بغرض سہولت دو عورتوں کا متبادل انتظام کر لیا جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو مردوں کے ہوتے ہوئے عورتوں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا ان شاذ نظیروں (جن کی رُو سے تنہا عورتوں کی شہادت پر ضرورت اور حالات کے مطابق فیصلے ہوئے) کو عموم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس طرح عورتوں کی گھروں سے باہر آمد و رفت بڑھ جائے گی۔ جو اپنے اندر بے شمار مفاسد لیے ہوئے ہے، لہٰذا اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا دائرہ کم سے کم کیا جائے۔

سابقہ بحث میں اسلام کے قانونِ شہادت میں عورت کے مقام و مرتبہ کا تعین کر لیا گیا ہے اور مقامِ شکر ہے کہ پاکستان میں بسنے والی عورتوں کی اکثریت اسلامی قانونِ شہادت پر مطمئن اور راضی ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے: اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (مائدہ ۵: ۵۰) کیا یہ لوگ جاہلیت کا قانون تلاش کرتے ہیں؟ یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ کے قانون سے بڑھ کر کس کا قانون اچھا ہو سکتا ہے۔

قانونِ الٰہی نہ ماننے والوں کا انجام قانونِ اسلامی اپنے اندر بے شمار حکمتیں رکھتا ہے۔ مولانا محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام و ممنوع قرار دیا ہے وہ پوری انسانیت کے مفاد کی خاطر اور حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ بخل یا اللہ کا

کوئی ذاتی فائدہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ان چیزوں کو اپنے کسی فائدہ کی خاطر روکنا چاہتا ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ علیم وخبیر اور حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم فضول اور بے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ لامحالہ انسان اور انسانیت کے لیے ضرر رساں ہیں۔ اگر ان میں کوئی نفع محسوس بھی ہو تو مضرت کا پہلو بہر حال نفع پر غالب ہوگا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی شہادت کو مرد کے مقابلے میں آدھا قرار دینا بھی اپنے اندر بے پناہ حکمتیں رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسانی فہم اس کا احاطہ نہ کر سکے۔ بہر حال ہمارے لیے برضا و رغبت اس کو ماننا اور بشرحِ صدر اسے قبول کرنا لازمی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔ ( )

"جب اللہ اور رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنا اختیار استعمال کرے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے۔ وہ بہت زیادہ گمراہ ہو گیا۔"

شریعتِ الٰہی کے مَن پسند احکام کو مان لینا اور جو ناگوار گزریں ان کو چھوڑ دینا یا ان کے متعلق تاویلیں کرنا اللہ اور رسول پر ایمان کے منافی ہے۔ اہلِ ایمان کا معیار یہی ہے کہ وہ کس حد تک خدا اور رسولؐ کے احکام کا پابند ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ

"ترجمہ: تم میں سے کوئی اہلِ ایمان ہو نہیں سکتا جب تک اس کی اپنی خواہشات میری لائی ہوئی تعلیم کے تابع اور ماتحت نہیں ہو جاتیں۔"

(باقی)